احسان

کا

صحیح اسلامی تصوّر

خرم مرادؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

احسان کا صحیح اسلامی تصور

کلامِ نبوی ﷺ میں سے حدیثِ جبریلؑ ہم سب کی سنی ہوئی اور ہمارے لیے معروف حدیث ہے۔ روایت کے مطابق حضرت جبریل علیہ السلام ایک انسان کی بھیس میں نبی کریم ﷺ کے حضور حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کے ساتھیوں کو دین کی تعلیم دینے کے لیے چند سوالات کیے: ایمان کیا ہے؟ اسلام کیا ہے؟ اور اس سلسلے میں یہ سوال بھی کیا کہ احسان کیا ہے؟ پھر قیامت کی گھڑی کے بارے میں سوال کیا کہ وہ کب آئے گی اور اس کی نشانیاں کیا ہیں؟ اس سوال کے جواب میں کہ احسان کیا ہے؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ 'تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو'۔

اس حدیث سے جو بات سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ جس طرح ایمان اور اسلام اس زمانے کے مسلمانوں کے لیے جستجو اور کاوش کا مرکز تھے، قیامت کی گھڑی کی تیاری لوگوں کے عمل و فکر کا محور و مرکز تھی، اسی طرح احسان بھی ایک ایسی چیز تھی، جس کو جاننے کی جستجو لوگوں میں پائی جاتی تھی۔ اس مقام کا بھی کوئی درجہ ہے، جس طرح ایمان اور اسلام یا آخرت کی تیاری کا ہے۔ اسی لیے صحابہ کرام ﷺ کو اس کی جستجو بھی تھی اور اسی وجہ سے جبریل علیہ السلام نے اس کے بارے میں سوال بھی کیا اور اس کا جواب بھی دیا گیا۔

احسان کا مفہوم

احسان کا لفظ عربی کے لفظ حسن سے نکلا ہے۔ ہمارے ہاں حسن کا لفظ بہت معروف ہے۔ حسن کے معنی خوب صورتی کے ہیں اور بھلائی کے بھی۔ حسن، حسنہ، احسن اور حسن، یہ سارے الفاظ ایک ہی مادے سے نکلے ہیں۔ ان سب کے اندر خوبی، بھلائی، اچھائی اور بہتری اور جمال و کمال کے معانی پائے جاتے ہیں۔ عمل میں بھی اللہ تعالیٰ کو یہی آزمایش کرنا ہے کہ کس کے اعمال زیادہ احسن ہیں:

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط
(الملک: ۲)

"(وہ) جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے، تم میں سے کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔"

گویا موت اور زندگی کا یہ سارا نظام بنایا ہی اس لیے گیا ہے کہ وہ تمھیں آزمائے کہ تم میں سے کس کے اعمال زیادہ احسن، زیادہ اچھے، زیادہ خوب صورت، زیادہ حسین، یا زیادہ جمال و کمال کے درجات تک پہنچے ہیں۔ اگر احسان کے یہ معنیٰ ہمارے ذہن میں رہیں تو پھر ہمارا ذہن عبادت اور بندگی اور صرف نماز تک محدود نہ ہونا چاہیے، جیسا کہ اس حدیث کو پڑھتے ہوئے اور اس کی تشریح کرتے ہوئے اکثر لوگوں کے ذہن صرف اسی پہلو تک محدود ہو جاتے ہیں۔

ہمارے نزدیک بندگی کا تصور بہت وسیع ہے۔ بندگی کا لفظ دراصل پوری زندگی میں اللہ کی اطاعت و فرماں برداری کا نام ہے۔ زندگی کا ہر کام بندگی ہے۔ نماز ہو یا روزہ، زکوٰۃ ہو یا حج، گھریلو زندگی ہو یا گھر سے باہر کی زندگی، کاروبار ہو یا تعلیم، دین ہو یا سیاست، قانون ہو یا حکومت، یہ سب بندگی کے کام ہیں۔ آزمایش پوری حیات کے لیے ہے۔ کسی ایک گوشے کے لیے نہیں۔ غرض گھر میں، باہر، گفتگو کرتے ہوئے، تعلیم و تدریس کے دوران میں، کوئی پیشہ ورانہ ذمے داری ادا کرتے ہوئے، جہاں بھی جو بھی کام ہوگا وہ بندگی ہوگی۔ اس لیے کہ مسلمان کا کوئی کام اللہ کی اطاعت و فرماں برداری سے ہٹ کر ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر یہ بھی کوشش ہونی چاہیے کہ جو بھی عمل ہو اچھا ہو، بہترین ہو اور کمال سے آراستہ ہو۔

ہمیں تو یہ تعلیم بھی دی گئی ہے کہ انسان کا اپنی بیوی سے جسمانی تعلق بھی بندگی اور

ثواب کا کام ہے۔ ایک بار صحابہ کرامؓ نے حیرت سے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا کہ کیا اس کا بھی ثواب ملے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم یہ کام غلط طریقے سے کرتے تو کیا عذاب نہ ہوتا؟ صحابہ کرام ﷺ نے عرض کیا: ہاں، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جائز طریقے سے خواہشِ نفس کی تسکین پر اجر ملے گا اور یہ بندگی کا کام ہے۔

نبی کریم ﷺ نے یہ ہدایت جو دی کہ جانور کو ذبح کرنے کے لیے چھری کو تیز کر لینا تا کہ اس کی جان آسانی سے نکلے، یہ بھی احسان ہے۔ گویا احسان کا دائرہ زندگی کے ہر پہلو پر محیط ہے۔ فرمایا گیا کہ بندگی کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اس لیے زندگی کا کوئی عمل اب اس سے باہر نہیں ہے۔ جس عمل کا بھی آپ تصور کریں، وہ بندگی کے اندر شامل ہے۔

احسان، حسن اور محسن

جیسا کہ گزشتہ سطور میں عرض کیا جا چکا ہے کہ احسان کا لفظ حسن، خوب صورتی، جمال اور اچھی چیز سے بنا ہے۔ اگر غور کریں تو حسن و عشق کی داستان جو اگرچہ بڑی سادہ اور رنگین ہے، لیکن انسان کی زندگی میں جو کچھ بھی حسن و جمال اور خوب صورتی ہے وہ اسی داستان کی وجہ سے ہے۔ حسن نام ہے اچھائی، بھلائی، خوب صورتی اور جمال و کمال کا۔ جب کہ عشق نام ہے اس حسن کی طلب، اس کے لیے اضطراب، بے چینی اور اس کے لیے تمنا، جستجو اور سعی و جہد کا۔ یہی وہ استعارے ہیں جو ہمارے ادب میں، ہماری شاعری میں اور ہمارے کلام میں انسان کے ان دو پہلوؤں کو ظاہر کرتے ہیں۔ انسان کی سرشت میں یہ دونوں چیزیں موجود ہیں۔ حسن کی کشش بھی ہے اور طلب بھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم کس چیز کو حسین سمجھتے ہیں اور کس حسن کے پیچھے دوڑنا چاہتے ہیں۔ یہ ہر شخص کا اپنا فیصلہ ہے۔ البتہ حسن کی طلب اور کشش اور حسن کے لیے وارفتگی اور والہیت ہر انسان کی فطرت میں ہے۔ کسی کو دولت میں حسن نظر آتا ہے، کسی کو چہرے میں، کسی کو علم میں حسن نظر آتا ہے، کسی کو نیکی میں اور کسی کو انسان کے ساتھ بھلائی کرنے میں حسن نظر آتا ہے۔ حسن، کمال اور اس کے لیے محبت اور عشق کا ہونا اور دل کے اندر اس کی طلب ہونا اور اس کے لیے آرزو و تمنا اور سعی و کوشش، یہی عشق کا کام ہے۔ عشق حسن کے پیچھے ہوتا ہے، اس کو طلب کرتا ہے اور اس کو پانے کی کوشش کرتا ہے۔

ضروری نہیں کہ عشق حسن کو پانے میں ہمیشہ کامیاب ہی رہے۔ لیکن اس کے لیے جو سعی واضطراب، بے چینی، تڑپ اور لپک برقرار رہتی ہے، اسی سے وہ اونچا اٹھتا ہے۔ اسی سے وہ منزلیں طے کرتا ہے اور سربلندی کے راستوں پر آگے بڑھتا اور بلندیوں پر پرواز کرتا ہے۔ اگر دل کے اندر عشق کی آگ سرد ہو جائے تو پھر آدمی راکھ کا ایک ڈھیر بن کر رہ جاتا ہے اور وہ دنیا کے اندر کوئی کارنمایاں انجام نہیں دے سکتا۔ گویا بڑائی اور بہتری کے لیے، بھلائی اور نیکی کے لیے اور خوب صورتی اور جمال وکمال کی جستجو کے لیے دل کے اندر ایک لگن، ایک تڑپ، ایک اضطراب، ایک بے چینی اور ایک شعلۂ فروزاں ہونا چاہیے۔ یہی عشق کی خاصیت ہے اور زندگی کا راز بھی اسی کے اندر پوشیدہ ہے۔

حسن وعشق کی داستان کا آغاز پہلے ہی انسان سے ہوتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی نظر ایسی زندگی پر تھی جو کبھی ختم نہ ہو اور ایسی بادشاہت پر تھی، جس پر کوئی زوال نہ ہو۔ اسی کے عشق میں گرفتار ہو کر انھوں نے پہلی غلطی کی اور پھر توبہ اور رجوع الی اللہ کا مقام ومرتبہ پایا اور قدر و منزلت کی اونچی منزلیں سر کیں۔

اگر غور کیا جائے تو تہذیب وتمدن کی بنیادیں، علمی ترقی وارتقا اور انسانی زندگی کی تعمیر و ترقی اسی جذبے کی مرہونِ منت ہے۔ تہذیب وتمدن کی کارفرمائیاں، عالی شان عمارتوں کی تعمیر اور اس تعمیر میں تزئین وآرایش کے فنون میں بہتر سے بہتر کی جستجو، اچھی شاعری، اچھا ادب، اچھی کتابیں اور اعلیٰ افکار کی تخلیق، یہ نتیجہ ہے زندگی میں حسن اور جمال وکمال کے لیے عشق کی طلب کا۔

میں پھر کہوں گا کہ حسن جہاں بھی ہو، کسی صورت میں بھی ہو اور جس کو بھی آدمی اپنی منزل قرار دے لے، یہ اس کا اپنا اختیار ہے۔ ایک عالم جس نے اپنی نگاہ کتاب پر جمالی، وہ اس کی نظر میں اتنی حسین ہوگی کہ اس سے نگاہ اٹھا کے کہیں اور نہ ڈالے گا۔ یہ تو انسان کا اپنا دل ہے کہ کسے حسین قرار دیتا ہے اور کس کے پیچھے لپکتا ہے۔ لیکن اسی حسن کے ساتھ عشق ومحبت کے نتیجے میں زندگی میں رنگ اور کیف بھی ہے اور اسی سے انسان عروج وکمال کی منزلیں بھی طے کر سکتا ہے۔ اسی سے وہ طویل ودشوار گزار راہوں سے گزر کر عظمت وبلندی کی معراج پر پہنچ سکتا ہے۔ حسن کے اندر کشش بھی ہوتی ہے اور لذت بھی اور تازگی بھی اور یہ آرزو وجستجو کا منتہا بھی بن سکتا ہے۔

آپ غور کریں کہ اس کائنات کے پیدا کرنے والے نے ہر جگہ حسن کو بکھیر دیا ہے۔ کائنات کا بنانا تو انسانی زندگی کے لیے ضروری تھا، لیکن انسان کی زندگی کو باقی رکھنے کے لیے کائنات کو حسین بنانا ضروری نہیں تھا۔ البتہ اس نے جو کچھ بنایا وہ بہترین سانچے میں بنایا۔ خود انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔ فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ○ (التین:۴)

''ہم نے انسان کو بہترین ساخت میں پیدا کیا۔''

زمین و آسمان، وسیع و عریض کائنات اس کی صناعی کی معراج کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ آسمان پر چھت بنائی تو اس کو ستاروں اور چمکتے ہوئے چراغوں سے جگمگا دیا اور اس میں سورج جیسا فانوس آویزاں کر دیا۔ دن کی کچھ اور شان ہے اور رات کی کچھ اور۔ اگر بیل بوٹے اور درخت بنائے ہیں تو ان میں ایک سے ایک حسین رنگ بکھیر دیا ہے۔ پھول انسان کی غذا کا کام نہیں دیتے، وہ اس کے جسم کو باقی رکھنے کے لیے ضروری نہیں ہیں، مگر خالق کائنات نے پھولوں کے اندر جو صناعی دکھائی ہے اور جس طرح حسن و جمال کی بارش کی ہے، انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔

اگر کائنات پر غور کیا جائے تو موت جیسی چیز میں بھی اس نے حسن کو پنہاں رکھا ہے۔ جب خزاں اور پت جھڑ کا موسم آتا ہے اور سردی بڑھتی ہے، تو پتے اپنی ہریالی جو زندگی کی علامت ہے، کھونا شروع کر دیتے ہیں اور درختوں پر خزاں کی زردی طاری ہوتی ہے۔ اگر اس زمانے میں جنگل میں جانے کا اتفاق ہو تو ہزار رنگ ہیں جن کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ جب پتوں پر موت کا لمحہ آتا ہے اور پتوں پر نزاع کا عالم طاری ہوتا ہے، ہزار رنگ ہیں جو ان پتوں پر طاری ہوتے ہیں۔ ان رنگوں کا امتزاج اس قدر حسین و دل کش ہوتا ہے کہ کوئی رنگ بنانے والی بڑی سے بڑی کمپنی یا بڑے سے بڑے مصور کا موے قلم تصور بھی نہیں کر سکتا جو رنگ پتوں کے اوپر، موسم خزاں میں، اس وقت طاری ہوتے ہیں جب وہ موت کی آغوش میں ہوتے ہیں۔

موت انسان کے لیے بھی خوب صورت چیز بن سکتی ہے:

نشان مرد مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

کسی کریہہ یا قبیح چیز کو دیکھ کر تبسم لبوں پر تو نہیں آ سکتا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ موت کا فرشتہ بڑا قبیح و

کریہہ اور ہولناک ہو، اس کے سینگ نکلے ہوئے ہوں، زبان سے شعلے لپک رہے ہوں اور بہت بھیانک ہو اور آدمی اس کو دیکھ کر مسکرائے۔ لیکن یہ مومن کی موت ہے کہ اس میں بھی اس کو اتنا حسن نظر آتا ہے، اتنی کشش نظر آتی ہے کہ وہ اس کی تمنا کرتا ہے، اس کو دیکھ کر مسکراتا ہے اور یہی اس کے ایمان کی نشانی ہے۔

یہ وسیع و عریض کائنات جو خدا نے تخلیق کی ہے، حسن و جمال اور حیرت و تحیر کا عظیم شاہکار ہے۔ اسی لیے خالق کائنات کو بہت سے لوگوں نے حسنِ ازلی کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی ایسا حسن جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ حسن ہمارے ادب اور کلام میں کائنات کے بنانے والے کے لیے ایک علامت بن گیا ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

ان اللہ جمیل یحبّ الجمال (مسلم، کتاب الایمان باب تحریم الکبر، حدیث: ۱۴۷)

”اللہ تعالیٰ خود بھی جمیل ہے اور جمال کو پسند بھی کرتا ہے۔“

وہ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ آدمی کے اندر ظاہری حسن اور کمال ہو۔ اس کے کپڑے بھی صاف ستھرے ہوں، خوش بو بھی لگی ہوئی ہو، ناک اور منہ سے بدبو بھی نہ آئے، مسجد بھی صاف ستھری ہو، گھر بھی صاف ہو اور کہیں گندگی نہ ہو اور وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ انسان کا دامن بھی گناہوں اور دھبوں سے پاک ہو۔

وَثِیَابَکَ فَطَهِّرْ o وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ o (المدثر: ۴، ۵)

اس کا مطلب ہے کہ کپڑے بھی پاک ہوں اور اخلاق بھی پاکیزہ ہوں۔

اصل بات تو حسن ازلی کی کشش ہے، جو زندگی میں رنگ اور کیف پیدا کرتی ہے۔ اسی لیے حدیث کے الفاظ ہیں کہ احسان تو یہ ہے کہ آدمی بندگی اس طرح کرے گویا کہ وہ اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ لہٰذا حسن کی تلاش یا حسین بننا یہ ہے کہ انسان کو یہ احساس ہو کہ وہ اس کی نظروں کے سامنے ہے۔ جو نظروں کے سامنے ہو، جس سے آدمی کو عشق و محبت بھی ہو اور طلب بھی، تو زندگی کا کون سا عمل ہے، جو کیف اور رنگ سے، عروج اور بلندی سے، حسن و جمال اور کمال سے خالی ہو سکتا ہے۔

حسن کے کئی پہلو ہیں۔ حسن معنوی بھی ہوتا ہے اور باطنی بھی۔ حسنِ اخلاق بھی ہوتا ہے اور حسنِ عمل بھی۔ مذکورہ حدیث میں ہے کہ احسان یہ ہے، یا حسن عمل یہ ہے کہ تم بندگی اس طرح

کرو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو۔ اللہ کو تو کوئی نہیں دیکھ سکتا، وہ نگاہوں میں نہیں سما سکتا، نہ نگاہیں اس پر ٹک سکتی ہیں اور نہ انسانی نگاہیں اسے دیکھ سکتی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ لَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا وَ کَلَّمَهٗ رَبُّهٗ قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ ط قَالَ لَنْ تَرٰنِیْ (الاعراف:۱۴۳)

"جب وہ (حضرت موسیٰ علیہ السلام) ہمارے مقرر کیے ہوئے وقت پر پہنچا اور اس کے رب نے اس سے کلام کیا، تو اس نے التجا کی کہ "اے رب! مجھے یارائے نظر دے کہ میں تجھے دیکھوں۔" (تو اللہ تعالیٰ نے) فرمایا: تو مجھے نہیں دیکھ سکتا۔"

اسی طرح اندر کی بصیرت بھی اس کو گرفت میں نہیں لے سکتی ہے:

لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ (الانعام:۱۰۳)

"نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں۔"

حدیث میں یہ نہیں کہا گیا کہ "تم اس کو دیکھ رہے ہو۔" بلکہ فرمایا گیا ہے کہ "گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔" مطلب یہ ہے کہ تمھاری کیفیت یہ ہو جائے کہ جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو۔

عشق کا لفظ دین کی زبان میں استعمال نہیں ہوا۔ قرآن مجید نے بھی استعمال نہیں کیا۔ لیکن عشق سے قریب قریب لفظ محبت بڑی کثرت سے استعمال ہوا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے صاف کہا ہے کہ اہل ایمان کی نشانی یہ ہے کہ وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط (البقرۃ:۱۶۵)

"حالاں کہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔"

ایمان کی یہ نشانی، کوئی ایسا کمال نہیں کہ یہ محض اولیا اور صوفیہ کا مقام ہو، بلکہ یہ ایک مومن کی نشانی ہے کہ وہ سب سے بڑھ کر اگر محبت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے کرتا ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے کہ جو محبوب ہوتا ہے، اس کی طلب ہوتی ہے۔ آدمی اس کے قریب ہونا چاہتا ہے۔ اس کی آرزو اور خواہش پر اس کی جان جاتی ہے اور دم نکلتا ہے اور اس کا ذکر زبان پر رہتا ہے۔ گویا سب سے بڑھ کر مومن کو اگر محبت ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ سے ہوتی ہے اور یہ محبت ہی دراصل احسان کو پیدا کرتی ہے۔

ضروری نہیں ہے کہ حسن و عشق کا وصال بھی ہو جائے۔ ضروری نہیں ہے کہ آدمی

اللہ تعالیٰ کو دیکھ بھی لے۔ لیکن یہ کہ وہ نگاہوں کے سامنے ہے۔ ایسا بن جانا ہی اعمال میں، زندگی میں، اس کی طلب میں، اس کی راہ میں سعی اور جہد میں وہ سارا کیف و رنگ پیدا کرتا ہے جو مطلوب ہے، جو احسان کا رویہ ہے۔ ایسے بندے کو محسن کہا گیا ہے۔ اسی احسان کی روش کے نتیجے میں محسن کو جنت کا مستحسن ٹھیرایا گیا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس کے نام کے ساتھ کوئی لیبل لگا ہوا ہے یا اس نے اولیا کا حلیہ بنا رکھا ہے۔ اسی طرح لوگ کہتے ہیں کہ یہودی یا عیسائی جنت میں جائیں گے، یا لوگ سمجھتے ہیں کہ امت مسلمہ سے تعلق ہونے کی بنا پر مسلمان جنت میں جائیں گے۔ قرآن نے صاف کہا ہے کہ ایسا نہیں ہوگا بلکہ جس نے اپنے آپ کو اللہ کے آگے ڈال دیا اور وہ احسان کے منصب پر بھی فائز ہو وہ جنت میں جائے گا:

بَلٰیۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠

(البقرۃ:۱۱۲)

"حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے، اس کے لیے اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے۔"

یہی محسنین ہیں جن سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۝ (البقرۃ:۱۹۵)

"اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔"

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ۝ (آل عمران:۱۴۶)

"کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں، جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے۔ انھوں نے کم زوری نہیں دکھائی، وہ (باطل کے آگے) سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔"

مگر اس کے بعد بھی انھوں نے اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کا احساس تھا۔ ان کی اگر کوئی تمنا یا دعا ہوتی ہے تو وہ یہی کہ:

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا

وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ○ (آل عمران:۱۴۷)

''ان کی دعا بس یہ تھی کہ: اے ہمارے رب، ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو اسے معاف کر دے، ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔''

یہ ہے محسن، یہ ہے احسان کی منزل کہ اللہ کے ان بندوں نے سب کچھ اس کی راہ میں لٹا دیا، نہ کم زوری دکھائی اور نہ کسی ضعف کا مظاہرہ کیا۔ اس کے باوجود یہی احساس غالب ہے کہ ہم سے کہیں کوئی خطا سرزد نہ ہو گئی ہو، کوئی زیادتی نہ ہو گئی ہو، ہم کہیں حد سے باہر نہ نکل گئے ہوں یا ہم سے کوئی ایسا کام نہ ہو گیا ہو جو خدا کے ہاں ہماری شرمندگی اور ندامت کا باعث بنے۔

احسان کے تقاضے

احسان ہی سے اللہ کی نگاہوں میں درجات اور مراتب کا تعین ہوتا ہے۔ احسان ہی سے فرد دنیا کے اندر اپنی شخصیت کو اعلیٰ سے اعلیٰ اور اونچے سے اونچے مقام اور مرتبے پر لے جاتا ہے۔ احسان ہی سے معاشرے ترقی اور عروج کی منزلیں طے کرتے ہیں اور جماعتیں اور گروہ طاقت ور اور مضبوط ہوتے ہیں اور تیز رفتاری کے ساتھ منزل کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس لیے احسان زندگی میں اور ماورائے زندگی کامیابی، فلاح، کامرانی، عروج اور ترقی کے لیے لازمی و ناگزیر ہے۔

احسان کا ترجمہ کسی اور زبان میں کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ عربی زبان کے الفاظ کو انگریزی یا اردو میں لغوی لحاظ سے منتقل کر دینا آسان نہیں ہے۔ ہم تو احسان کو بڑے محدود معنوں میں جانتے ہیں۔ ہمارے نزدیک کسی کے ساتھ بھلائی یا نیکی کر دینا احسان ہے۔ لیکن عربی زبان میں اس کے بڑے وسیع معنی ہیں۔ اگرچہ انگریزی میں بھی اس کا ترجمہ بڑا مشکل ہے۔ لیکن میرے نزدیک انگریزی کا احسان کے معنوں میں قریب ترین لفظ Excelence ہے۔

اس سے مراد یہ ہے کہ جو بھی کام کیا جائے وہ بہت اچھا، بہت معیاری اور اعلیٰ پائے کا ہو۔ کام خواہ کسی بھی دائرے میں ہو، معاشی دائرہ ہو یا تجارتی، سیاسی دائرہ ہو یا مذہبی، بہترین ہو اور اعلیٰ درجات اور اعلیٰ مراتب پر پہنچانے والا ہو۔ یہ ہر ایک کی خواہش ہے، مومن کی بھی اور کافر

کی بھی، دنیا پرست کی بھی اور دین دار کی بھی۔ جو بھی کچھ بننا چاہتا ہو، کچھ کرنا چاہتا ہو، کہیں پہنچنا چاہتا ہو، بلندیوں پر پہنچنا ہو، اس کو احسان یا Excelence کے تصور سے مفر نہیں۔ گویا احسان خوب سے خوب تر کی تلاش، بلند سے بلند مقام تک پہنچنے کی ممکنہ سعی، آرزو اور تمنا کا نام ہے۔

نبی کریم ﷺ نے جب یہ فرمایا کہ ''جب تم اللہ کی بندگی کرو تو اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔'' تو اس سے آپ ﷺ کی مراد زندگی کا ہر کام ہے۔ وہ اس لیے کہ اسلام میں بندگی کا تصور زندگی کے ہر دائرے پر محیط ہے۔ کوئی پہلو بھی اس سے خارج نہیں۔ لہٰذا ہر کام اس بندے کی طرح ہونا چاہیے، جس کا تصور یہ ہو کہ وہ خدا کی نگاہوں کے سامنے ہے، جس کی رضا و خوش نودی اس کو مطلوب ہے۔

رضائے الٰہی کی طلب کے لیے قرآن مجید نے جو اصطلاح استعمال کی ہے وہ ابتغاے مرضات اللّٰہ اور ابتغاے وجہ اللّٰہ ہے۔ اگر اس کا لفظی ترجمہ کریں تو اس کا مطلب ہوگا کہ اللہ کے چہرے کی تلاش۔ وہ تلاش جس کے بارے میں قرآن نے کہا کہ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ (الرحمٰن: ۲۷) وہ چہرہ جس کے اندر جلال بھی ہے اور اکرام و جمال بھی۔ جو لوگ دونوں چیزیں تلاش کرتے ہیں، یعنی اللہ کے چہرے کی تلاش بھی اور اس کی خوش نودی بھی۔ یُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ (الروم: ۳۸) ''جو اللہ کی خوش نودی چاہتے ہیں'' یہ وہ گروہ ہے جو اللہ کو محبوب ہے۔

اللہ کے چہرے کی تلاش سے دیکھنے کا تصور سامنے آتا ہے۔ فطری امر ہے کہ جس سے آدمی کو محبت ہوتی ہے، دل چاہتا ہے کہ اس کو دیکھتا رہے۔ اگر یہ معلوم ہو کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے اور وہ میری نظروں کے سامنے ہے تو پھر کوئی کام ایسا نہیں ہوسکتا، جو اس کی مرضی کے خلاف ہو۔ پھر آدمی دوڑ دوڑ کے ہر وہ کام کرتا ہے اور اچھے سے اچھے طریقے سے کرتا ہے، جو اس کے محبوب کو پسند ہو۔ تاکہ اپنے محبوب سے داد پائے اور اس کی خوش نودی حاصل کرے۔ اگر آنکھ کے اشارے سے خوشی کا اظہار ہو جائے یا چہرے پر مسکراہٹ آجائے تو عاشق کے لیے یہ بہت بڑی نعمت ہے۔

غزوۂ تبوک کا مشہور واقعہ ہے تین صحابہ کرامؓ کو ۵۰ دن کے بائیکاٹ کی سزا دی گئی۔ ان میں سے ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں مسجد میں آتا تھا، حضور ﷺ کو سلام کرتا تھا، مگر آپ ﷺ جواب نہیں دیتے تھے۔ پھر میں آپ ﷺ کی آنکھوں کی طرف اور چہرے کی طرف

دیکھتا رہتا تھا کہ کوئی جنبش ہوئی یا نہیں اور جب میں دیکھتا کہ جنبش ہوئی ہے تو سمجھتا تھا کہ آپ ﷺ کے دل میں میری محبت اور میرا مقام باقی ہے۔

یہ ہے چہرے کی طرف دیکھنا یا چہرے کی تلاش۔ یہ وہی بات ہے جسے ہم اردو محاورے میں چشم و ابرو کا اشارہ کہتے ہے۔ لیک کے محبوب کی مرضی پوری کرنے کے لیے اور اس کی راہ میں اپنے آپ کو لٹا دینے اور نچھاور کردینے کے لیے اشارہ بھی کافی ہوتا ہے۔ یہ ہے دراصل: وَمَا تُنفِقُوْنَ اِلاَّ ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ (البقرۃ:۲۷۲) ”تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔“

یہ اصطلاحات اسی لیے ہیں کہ آدمی اپنی زبان میں، اپنے ادب میں، اپنے پیرایے میں سمجھ سکے کہ فی الواقع مطلوب کیا ہے، جس کی آرزو ہو، جس کی محبت ہو یا جس کی طلب ہو۔ اس کے لیے جستجو بھی ہوگی اور تگ و دو اور محنت بھی۔ اسی سے احسان کا ایک دوسرا پہلو بھی سامنے آتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ اس کی طلب ہو بلکہ اللہ کی توجہ حاصل ہو۔ وجہ سے ہی توجہ کا لفظ نکلا ہے۔ توجہ حاصل ہونا بھی معروف ادبی پیرایہ ہے، یعنی اس کا چہرہ حاصل ہو یا اس کی توجہ ہمارے حصے میں آئے۔

توجہ حاصل کرنے کے لیے صرف محبت کا دعویٰ کافی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے لیے تو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اپنے آپ کو رسوا بھی کرنا پڑتا ہے، انجام سے ہاتھ بھی دھونا پڑتا ہے، راتوں کو اٹھ کے ہاتھ بھی پھیلانے پڑتے ہیں، ہاتھ باندھ کے کھڑا بھی ہونا پڑتا ہے۔ آہ سحرگاہی کے بغیر کچھ ہاتھ نہیں آتا، نہ عشق مجازی کی منازل طے ہوتی ہے، نہ عشق حقیقی کی۔ لہٰذا آہِ سحرگاہی بھی اسی کا حصہ ہے۔ جستجو، طلب، تگ و دو اور محنت یہ سب چیزیں تو اس کے ساتھ ساتھ موجود ہی ہیں۔ لیکن احسان میں یہ مطالبہ نہیں ہے کہ جیسا کہ محبوب کا حق ہے آدمی ویسا ہی کرے، بلکہ یہ مطالبہ ہے کہ اپنی استطاعت اور ہمت کے مطابق جو کچھ کر سکتے ہو، کر گزرو۔ صرف اتنا ہی مطالبہ ہے، اس سے زیادہ کوئی مطالبہ نہیں۔

عشق کو تو جس بات کی طلب ہوتی ہے، وہ یہ کہ اسے حسن حاصل ہو اور حسن کو جس چیز کی امید اور توقع ہوتی ہے، وہ یہ کہ عشق اس کی طلب میں، اس سے ملاقات کے شوق اور تیاری میں، اس کے قرب میں اور اس کی مرضی پوری کرنے میں لگا رہے۔ اس کو اس سے دلچسپی نہیں

ہوتی کہ وہ کن مقامات پر پہنچے گا اور کیا کچھ حاصل کرے گا۔ اس کے پیشِ نظر یہ معیار نہیں ہوتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ اصل چیز جو اس کو مطلوب ہے، وہ اس کا ارادہ ہے اور اس سے ملاقات کی تیاری کے لیے کوشش اور سعی ہے، جس نے یہ دو کام کر لیے بس یہی کافی ہیں۔ اسے اور کوئی چیز نہیں چاہیے۔

وَ مَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَ سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ○ (بنی اسرائیل:۱۹)

''اور جو آخرت کا خواہش مند ہو اور اس کے لیے سعی کرے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے اور ہو وہ مومن، تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہوگی۔''

آخرت تو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا نام ہے اور آخرت کا ارادہ وہی کر سکتا ہے، جس کو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا شوق بھی ہو۔ اسی لیے دعاؤں میں تعلیم دی گئی ہے: شوق لقائک تجھ سے ملاقات کا شوق ہے۔ جب شوق ہوگا تو اس کے لیے تیاری بھی ہوگی اور اس کے لیے محنت بھی کرنی پڑے گی۔ لہٰذا جس نے اس کی کوشش کی اور اس کے دل میں ایمان بھی ہے، تو اس کی ساری کوششوں کی پوری پوری قدر دانی کی جائے گی، پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور اسے خدا کی خوش نودی اور اس کی رضا حاصل ہوگی۔ خدا کی رضا و خوش نودی سب سے بڑی چیز ہے۔

احسان کی منزل

ہر شخص احسان کی منزل پہ پہنچ سکتا ہے۔ ہر شخص کے لیے احسان کے حصول کی تگ و دو کا راستا کھلا ہوا ہے اور ہر کام کے اندر کھلا ہوا ہے۔ کوئی کام ایسا نہیں ہے، جو احسان کی تگ و دو اور احسان کی جستجو سے باہر ہو۔ آدمی جھاڑو دے رہا ہو تو وہ کام بھی اسی جستجو سے کیا جا سکتا ہے۔ مسجد میں لوگ جھاڑو لگاتے ہیں، دل ایک کیف سے معمور ہوتا ہے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے ہیں، اس طرح جھاڑو لگانے کے کام میں ہی احسان کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح میدانِ جنگ میں بھی اپنی جان قربان کر کے احسان کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ نمازوں میں کھڑے ہو کر خشوع و خضوع کے ساتھ نماز کی ادائی اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگیں تو اس سے بھی احسان کا مقام حاصل ہوتا ہے۔ غرض کوئی کام ایسا نہیں اور کسی کام کا کرنے والا ایسا نہیں جو احسان کا مقام

حاصل نہ کر سکتا ہو۔ مالک کی نظر میں کوئی بھی کام اتنا حقیر نہیں کہ وہ احسان کی منزل تک نہ پہنچ سکتا ہو۔ اگر اندھا آدمی قرآن نہ پڑھ سکتا ہو اور صرف لائنوں پر انگلی پھیرتا رہے تو وہ بھی احسان کے مقام پر پہنچ جائے گا اور شاید اس خوش الحان قاری سے زیادہ پہنچ جائے جو بڑے کیف کے ساتھ اس لیے قرأت کرتا ہے کہ لوگ اسے اچھا قاری کہیں۔ وہ اندھا آدمی جو نہیں پڑھ سکتا، اس کا مرتبہ اس لیے بلند ہے کہ اس کو اپنے محبوب کی تلاش ہے، اس کا دل اس کے لیے غمگین ہے، اس کے لیے وہ ٹوٹا ہوا ہے اور وہ اس کے لیے سعی و جستجو کر رہا ہے۔

کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام ہو یا بڑے سے بڑا کام، آدمی گھر میں ہو یا باہر، اللہ کا کام کرتے ہوئے وہ ایک فائل ادھر سے اُدھر کر رہا ہو یا لاکھوں افراد کے سامنے کھڑے ہو کر تقریر کر رہا ہو، ایک چھوٹے سے مقام پر دو آدمیوں کو لے کر چل رہا ہو یا لاکھوں آدمیوں کو لے کر چل رہا ہو، احسان ہر ایک کی منزل ہونی چاہیے۔ مقامِ احسان پر ہم میں سے ہر ایک پہنچ سکتا ہے اور اسی حد تک احسان ہے، جو ہمارے دائرۂ کار اور ہماری حدِ استطاعت میں ہے۔ زندگی کا کوئی کام ایسا نہیں ہے جو اس سے باہر ہو۔

احسان اور آرزوے دل

احسان کو جو چیزیں ختم کر دیتی ہیں، ان میں سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ یہ آرزو ہی دل سے محو ہو جائے کہ ہم جو کام کر رہے ہیں، اس کام کو اچھے سے اچھا کرنا ہے اور اس کو اونچے سے اونچے معیار پر لے جانا ہے اور اس میں خوب سے خوب تر کی تلاش ہو۔ ایسا اچھا، ایسا خوب اور ایسا حسین جو اللہ کی نگاہ میں بھی حسین ہو اور اپنے کام کے لحاظ سے بھی حسین و خوب صورت ہو۔

حسن کا ایک معیار نہیں ہو سکتا۔ ہر چیز کے لیے حسن اس چیز میں اسی طرح ہے، جیسا کہ اس کو ہونا چاہیے اور اس میں وہ کمال کے درجے کو پہنچ جائے۔ درخت کا حسن یہ نہیں ہے کہ اسے انسانی لباس پہنا دیا جائے یا انسان کا حسن یہ نہیں ہے کہ وہ درخت کی طرح پھول پتے پہن کر کھڑا ہو جائے۔ انسان کے لیے حسین بننے کا طریقہ اور ہے، درخت کے لیے کچھ اور۔ کوّے کے لیے کچھ اور ہے اور بگلے کے لیے کچھ اور۔ سب کے لیے قدرت نے الگ الگ ان کے لحاظ سے کمال کے معیار بنا دیے ہیں۔ اگر معیارِ کمال اور اس کے لیے جستجو کی آرزو ہی دل میں نہ رہے تو اس کے بعد پھر آدمی اس کی فکر چھوڑ دیتا ہے اور بے نیاز ہو جاتا ہے۔ پھر یہ سوچ بن جاتی ہے

کہ نماز جس طرح پڑھ رہے ہو اسی طرح پڑھتے رہو، نظم جس طرح چل رہا ہے اسی طرح چلاتے رہو، جس طرح آج سے دس سال پہلے درس دیے ہیں، ویسے ہی درس آج بھی دے دو، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دل کو کوئی فکر، تشویش، پریشانی نہیں یا کوئی طلب یا آرزو نہیں ہے کہ جو کام بھی ہو اپنے معیار کے لحاظ سے بہتر سے بہتر ہو۔

احسان کے مہلکات

احسان کے ضمن میں چند مہلکات ہیں۔ مہلکات کے معنی ہلاک کرنے والی چیزوں کے ہیں۔ یہ احسان کو اور اس کے درجے کو کھا جاتی ہیں، ان کو ختم کر دیجیے۔ ان میں پہلی چیز قناعت ہے۔ یہ بات چونکا دینے والی ہے کہ قناعت مہلکات میں سے ہے۔ جب کہ قناعت تو بڑی پسندیدہ اخلاقی صفت ہے۔

قناعت

یقیناً دنیا کے معاملات میں قناعت بڑی پسندیدہ اور بڑی محبوب چیز ہے۔ لیکن جو آدمی اللہ کی بندگی اور اللہ کے لیے کام کرنے میں اور زندگی کے فرائض کی تکمیل میں قانع ہو جائے یا یہ کہ جو کام جیسا ہو رہا ہے ویسا ہی ہوتا رہے تو وہ پھر اوپر نہیں اٹھ سکتا۔ اسے اس کا تو اجر ملے گا جو کچھ وہ کرے گا لیکن نہ وہ دنیا میں بڑی بڑی منزلیں سر کر سکتا ہے اور نہ آخرت میں ان درجات پر فائز ہو سکتا ہے، جن درجات کی کوئی حد نہیں ہے۔ لہٰذا اگر آدمی جو کچھ ہو رہا ہے، جیسا ہو رہا ہے، اسی پر قانع ہو جائے، جو کم تر ہے اسی کو خوب تر سمجھے تو پھر اس کے بعد احسان کی طلب اور احسان کی روش دونوں ہی اس سے برباد اور ضائع ہو جاتی ہیں۔ پھر یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ نماز جس طرح بھی پڑھ لی سو پڑھ لی، روزہ جس طرح ہوتا تھا ہو گیا، کبھی وقت ملا تو قرآن اُٹھا کر دیکھ لیا، لٹریچر کے اتنے صفحے پڑھ لیے کہ جو رپورٹ میں لکھنے کے لیے کافی ہوں تو ایسا انسان جو بے نیاز ہو جائے اور بے پروا ہو جائے، اس کے نزدیک جو کام جس طرح ہو رہا ہے، بس بہتر ہی ہو رہا ہے۔ یہ قناعت آگے بڑھ کر احسان کو، احسان کی طلب کو، احسان کی آرزو کو اور احسان کی روش کو بھی ختم کر سکتی ہے۔

غفلت و بے نیازی

اس سے بھی آگے کا درجہ یہ ہے کہ آدمی اس سے بالکل غافل ہو جائے کہ اس کو کیا بننا تھا اور کیا نعمتیں ہیں جو اس سے چھنتی چلی جا رہی ہیں اور کون اس کی نگاہوں کے سامنے ہے کہ جو اسے دیکھ رہا ہے اور ہر وقت ساتھ ہے اور شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اگر ایک ہے تو دوسرا وہ ہے، دو ہیں تو تیسرا وہ ہے، تین ہیں تو چوتھا وہ ہے۔ بندگی کے دوران میں یہ احساس نہ رہے کہ وہ موجود ہے اور دیکھ رہا ہے یا آدمی غافل ہو جائے تو اس کے بعد نمازیں، روزے اور زکوٰۃ اور حج، سب بے روح اور بے جان ہو جاتے ہیں۔ یہ انسان کی روحانی، اخلاقی، معنوی اور قلبی ترقی میں کوئی اضافہ نہیں کرتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ان کا اجر ضائع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اتنا کڑا معیار نہیں رکھا۔ البتہ جو بڑے بڑے کاموں کا حوصلہ کر کے میدان میں اتریں، جن کی زبانوں پر بڑے بڑے کاموں کے دعوے ہوں، جن کے پیش نظر اللہ کے محبوب ترین کام جہاد اور اقامت دین ہوں، وہ اس طریقے سے اپنی منزلوں پر نہیں پہنچ سکتے۔

غفلت اور بے پروائی، قناعت اور بے نیازی، یہ وہ چیزیں ہیں، جن سے آدمی زندگی گزارتا چلا جاتا ہے اور اس کا ہر نیا دن گزشتہ دن سے بہتر نہیں ہوتا۔ وہ زندگی کے زینے پر اگلا قدم اوپر کے زینے پہ نہیں رکھتا بلکہ وہیں اپنے مقام پر کھڑا کھڑا مارچ کرتا رہتا ہے، اوپر نیچے پاؤں کرتا رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میں آ جا رہا ہوں۔ حالاں کہ اس کے درجات میں کوئی ترقی نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ وہ قانع ہے۔ اس کو اس بات کی کوئی پروا نہیں ہے کہ اوپر کیا منزلیں ہیں اور مجھے کہاں پہنچنا ہے۔ وہ اس سے بے نیاز ہوتا ہے کہ اپنی تقریر اور تحریر کو، اپنے کردار اور اخلاق کو، اپنے برتاؤ اور گفتگو کے انداز کو، اپنی لیڈر شپ کو، اپنی عبادت کو، اپنی بندگی کو اور اپنی نماز اور ذکر کو مجھے کس مقام پہ پہنچانا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کو قبول ہوں۔

ایک مثال

انسان کو کتنا خود بین ہونا چاہیے یا کس بات کی پروا کرنی چاہیے اس کی ایک مثال ہماری مینجمنٹ سائنسز میں سکھائی جاتی ہے۔ ایک کہانی بیان کی جاتی ہے، پتا نہیں وہ صحیح ہے یا غلط، بہرحال لوگوں نے سمجھانے کے لیے ایک کہانی وضع کی ہے:

ایک مالک نے (یہاں میں مالک کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کر رہا ہوں) کچھ لوگوں کو اشتہار دے کر ملازمت کے لیے بلایا۔ کافی لوگ جمع ہو گئے۔ انٹرویو کے وقت مالک خود دور ایک کمرے میں جا کے بیٹھ گیا۔ اس کے کمرے میں ایک کھڑکی تھی، جس سے وہ سب کچھ دیکھ سکتا تھا۔ البتہ انٹرویو دینے والے اسے نہیں دیکھ سکتے تھے۔

کمرے میں ایک بہت لمبا چوڑا خوب صورت قالین بچھا ہوا تھا۔ اس قالین پر ایک باریک سی سوئی پڑی تھی۔ انٹرویو کے لیے آنے والے اور ملازمت کے خواہاں ہر آدمی کو پکارا جاتا تھا۔ وہ چل کے کمرے میں جاتا تھا اور اپنی صلاحیت اور کوالیفکیشن کے مطابق انٹرویو دے کر خوش خوش واپس آتا کہ شاید میرا انتخاب ہو جائے۔ ایک آدمی اٹھا جو بہت اچھے لباس میں ملبوس تھا، اس نے سوئی دیکھی تو اسے جھک کر اٹھا لیا اور ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا اور جا کے انٹرویو دے آیا۔ اس کو منتخب کر لیا گیا۔

اس نے اندر جا کر جو کچھ کہا اور اپنی جن صلاحیتوں کا اظہار کیا وہ تو مالک نے دیکھ لیا، مگر جس چیز نے اس کے اندر میں فیصلہ کن کردار ادا کیا وہ یہ تھی کہ یہ آدمی اتنا فکر مند ہے، اس کو اتنی پروا ہے کہ اس نے ایک سوئی بھی اگر دیکھی تو اس کو برداشت نہیں کیا اور ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ یہ آدمی خواہ کوئی بھی کوالیفکیشن نہ رکھتا ہو، مگر اس کے اندر وہ جوہر موجود ہے جو ہر چیز کی فکر کرے گا، ہر چیز میں آگے بڑھے گا، اپنے آپ کو ترقی دے گا، پروان چڑھائے گا اور میرا کام بھی پورے اہتمام کے ساتھ پوری ذمے داری کے ساتھ کرے گا۔

یہ جذبہ دینی لحاظ سے اور آخرت میں اللہ کی نگاہوں میں درجات کی بلندی کے لیے اس کے قرب کے لیے بھی ناگزیر ہے۔ دنیا میں بھی آگے بڑھنے کے لیے، ملک و ملت، معاشرے اور گروہوں کے لیے اس کے بغیر کوئی راستا عروج اور ترقی کا نہیں ہے۔

خود شناسی

انسان کی شخصیت میں اللہ تعالیٰ نے جو بے پناہ جوہر رکھا ہے، اس کا اندازہ کوئی انسان نہیں کر سکتا۔ بظاہر یہ مٹی کا ایک تودہ اور ایک مشت خاک ہے، مگر اس مشت خاک میں دوشِ ثریا کی استعداد موجود ہے۔ یہ استعداد ہر انسان میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی یہ نہیں کہا کہ میں

نے کسی خاص آدمی کے جسد میں اپنی روح پھونکی ہے بلکہ فرمایا:

وَ نَفَخۡتُ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِيۡ (ص:۷۲)

''میں نے ہر مٹی کے بنے ہوئے انسان کے جسد میں اپنی روح پھونکی''۔

عام طور پر میں اس کی مثال ایٹم سے دیتا ہوں۔ ایٹم کا ذرہ، ایک بے حقیقت ذرہ جس کو خردبین سے بھی نہیں دیکھا جاسکتا۔ لیکن سائنسی تحقیقات سے انسان نے جان لیا کہ اس ذرے کو توڑا جائے تو اس کے اندر کیا قوت برپا ہوگی۔ اسی چھوٹے سے ذرے سے وہ قوت برپا ہوگی، جو بے پناہ تباہی بھی لاسکتا ہے اور بے پناہ تعمیر کا کام بھی کرسکتی ہے۔ اسی طرح ہر انسان ایٹم کی طرح ہے۔ ہم خود اپنے آپ سے ناآشنا ہوتے ہیں، اپنے آپ کو نہیں جانتے اور دوسرے بھی ہم کو نہیں جانتے۔ اسی طرح جو ہم کو چلانے والے ہیں، جو ہمارے قائد ہیں وہ بھی ایک چیز کی طرح اور ایک شے کی طرح ہمارے ساتھ معاملہ کرتے ہیں اور ہم پوری عمر اسی طرح گزار جاتے ہیں۔ لیکن جب کوئی ایسا پارس پتھر آجائے جسے آپ چھوئیں اور سونا بن جائیں اور خود آدمی کو آگاہی ہوجائے اور وہ اپنے آپ کو جان جائے اور احسان کی تلاش میں نکل پڑے تو پھر بدو اور بکریاں چرانے والے اور چھوٹے چھوٹے دکان دار بھی امام اور لیڈر بن جایا کرتے ہیں اور ان کے اندر بھی یہ صلاحیت پیدا ہوجایا کرتی ہے۔ یہ محض نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے سے نہیں ہوتی بلکہ یہ اسی احسان کی تلاش سے اور احسان کی منزل تک پہنچ کر حاصل ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک غلام بھی ایران کا گورنر بن سکتا ہے، ایک کسان بھی دنیا کا ایک عالم مقتدر بن سکتا ہے۔ وہ غلام جو گرفتار ہوکر آئے تھے، وہ مدینے اور مکے کے اندر علم وفن کے سرچشموں کے امام بن گئے۔ ایک وقت میں سات علماء گنے گئے۔ ان میں سے چھے وہ تھے جو جنگی قیدی اور غلام بن کر آئے تھے۔ ان کے اندر یہ استعداد پیدا ہوئی کہ عرب وعجم سب ان سے مستفید ہوئے۔

ہر انسان میں اللہ نے صلاحیت رکھی ہے، لیکن آدمی کی شخصیت کا ارتقا تو اسی وقت ہوسکتا ہے، جب وہ اپنے سامنے منازل رکھے، ان کی طرف پرواز کی کوشش کرے اور اپنی صلاحیت کو استعمال کرے۔ اسی طریقے سے اس کو اطمینان قلب نصیب ہوگا۔ جب آدمی کسی منزل کے لیے کاوش کرتا ہے اور اس کو حاصل کرتا ہے تو دنیا میں بھی اس کے حصے میں حسن آتا ہے، بھلائی آتی ہے، بہتری آتی ہے اور آخرت میں جس چیز (جنت) کا وعدہ ہے وہ بھی اسے

ملے گی۔ وہ جنت جس میں پھل ہیں، غذا ہے، برتن ہیں، محلات ہیں، بیٹھنے کے لیے تکیے اور غلاف ہیں، جن کے بارے میں فرمایا گیا:

عَبۡقَرِيٍّ حِسَانٍ ۝ (الرحمٰن ۵۵:۷۶)

"وہ انتہائی درجے کی خوب صورت چیزیں ہیں۔"

یہاں کوئی چیز ایسی نہیں جو حسن سے خالی ہو۔ ہر چیز میں حسن کا بیان ہے۔ گویا دنیا میں بھی حسن ہے اور آخرت میں بھی حسن۔

احسان اور معاشرہ

احسان جس طرح ایک فرد کی تعمیر سیرت اور بلندی درجات کا باعث ہے، اسی طرح کسی بھی معاشرے کے لیے ناگزیر ہے۔ معاشرے کی بقا، اس کی صحت، اس کی مضبوطی اور اس کی ترقی کے لیے احسان ضروری ہے۔ جو معاشرے اس چیز سے خالی ہوتے ہیں، ان کی مثال ہمارے معاشرے میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ آئے دن کا مشاہدہ ہے کہ ہمارے ہاں ہر شخص اپنا کام ٹالنے کے لیے کرتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر پایا جاتا ہے کہ کام برا بھلا جیسا بھی ہو جائے کر کے اپنے سر سے بوجھ اتارو۔ استاد ہو یا شاگرد، دکان دار ہو یا کلرک، شاذ و نادر ہی ایسے لوگ ملیں گے جو چاہتے ہوں کہ اپنے کام کو اچھا بلکہ بہترین انداز میں کریں۔ یہ معاشرتی زوال اور پستی کی علامت ہے۔ اس کے مقابلے میں اُن معاشروں کو دیکھیے جو اللہ کو نہیں مانتے، نماز نہیں پڑھتے، روزہ نہیں رکھتے، زنا کاری کرتے ہیں، شراب پیتے ہیں۔ غرض کہ مختلف چھوٹی بڑی برائیوں میں مبتلا ہیں۔ مگر وہ جو کام بھی کرتے ہیں اس کو اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر کرتے ہیں۔ اگر بدمعاشی بھی کرتے ہیں تو اس کو بھی اعلیٰ پیمانے پر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے کہ عمدگی کی تلاش ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ وہ اسی وجہ سے دنیا کے اندر غالب ہیں اور آگے ہیں۔ لہٰذا فرد کے لیے، معاشروں کے لیے، جماعتوں کے لیے اور گروہوں کے لیے صحت، ترقی اور کمال و بقا کی علامت بھی احسان ہے۔ احسان کے بغیر کسی بلندی یا ارتقا کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اللہ کی رضا، مطلوبِ حقیقی

اگر احسان کے یہ معنی پوری طرح ہماری سمجھ میں آجائیں اور اس کی ضرورت واہمیت

بھی سامنے آ چکی ہے تو پھر ہم لوٹ کے اسی حدیث کی طرف جاتے ہیں، جس میں کہا گیا تھا کہ ''اللہ کی بندگی اس طرح کرو گویا کہ تم اس کو دیکھ رہے ہو۔'' اس لیے کہ اگرچہ تم اس کو دیکھ نہیں رہے مگر وہ تو تمھیں دیکھ رہا ہے اور تم اس کی نگاہوں میں ہو۔

اللہ نے جب اپنے بندوں کو احسان اور صبر کی تعلیم دی تو یہ کہہ کر دی کہ تم ہماری نگاہوں کے سامنے ہو۔ جو تم کہو گے، وہ میں سنوں گا اور تم جہاں اور جس حال میں ہو گے وہ میں دیکھوں گا۔ یہی کیفیت تھی جس نے لوگوں کو بڑے بلند مرتبوں تک پہنچا دیا کہ ہم اللہ کی نگاہوں کے سامنے ہیں اور اسی لیے جو کام کر رہے ہوں اس کو دیکھ کر کر رہے ہوں۔ اصل چیز تو اللہ کی رضا اور اس کی طلب ہے اور وہی مطلوب حقیقی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو اصل ہدف، مقصد اور نصب العین ہونا چاہیے۔ جس چیز پر نگاہ جم جائے، ٹھیر جائے اور وہاں سے ہٹنے کا نام نہ لے، اسے نصب العین کہتے ہیں۔ جو چیز بھی پسند آ جائے، کوئی انسانی چہرہ پسند آ جائے تو اس پر آدمی کی نگاہ جم جاتی ہے، ہٹنے کا نام نہیں لیتی اور اگر ہٹتی ہے تو پلٹ کے بار بار جاتی ہے۔ کوئی چیز خوب صورت لگتی ہے تو آدمی اس پر نگاہ جما لیتا ہے۔ اس کے بس میں اس کا دل نہیں رہتا، اس کی نگاہ اسی پر جمی رہتی ہے۔ اسی کا نام نصب العین ہے۔

نصب کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو جما دینا اور عین کے معنی آنکھ کے ہیں۔ نصب العین گویا آنکھ کو کسی چیز پر پوری طرح جما دینا ہے۔ قرآن اسی لیے بار بار کہتا ہے: وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ (الکہف: ۲۸) نگاہ اِدھر اُدھر نہ جائے بلکہ اللہ پر جمی رہے، اور اسی کے حصول کی طلب رہے۔ لہٰذا مقصد کے ساتھ وابستگی وہ چیز ہے کہ جو احسان کے لیے سب سے پہلے مطلوب ہے۔

احسان کے لیے صرف صلاحیت کافی نہیں ہے۔ صلاحیتیں تو انسان کے اندر بہت ہیں، پیدا ہو سکتی ہیں اور پروان چڑھ سکتی ہیں۔ بڑے بڑے کام انجام دیے جا سکتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ اس کے اندر یہ آرزو تو ہو کہ مجھے کچھ بننا ہے، کچھ کر کے دکھانا ہے۔ میں جیسا ہوں، مجھے اس پر قانع نہیں رہنا بلکہ اس سے بہتر بننا ہے۔ اگر یہ جذبہ اور تمنا نہ ہو تو آپ ہزار فتوے جاری کر دیں، ہزار منصوبے بنا لیں اور ہزار رپورٹیں لے لیں، کسی کام میں ترقی نہیں ہو سکتی۔ لیکن جب انسانوں کے اندر احسان کی تڑپ پیدا ہو جائے، حسن کی طلب پیدا ہو جائے، ہر کام میں حسن ہو، رپورٹ ہو تو وہ بھی حسین ہو، تو پھر آپ دیکھیے کہ کام کے اندر کتنی ترقی ہوتی ہے۔ جب آدمی اس پر قانع

نہیں ہوگا کہ اجتماع بھگتا دیا اور رپورٹیں لے لیں، بلکہ سوچ یہ ہو کہ اگر آج اجتماع ہوا ہے تو اگلے ہفتے اس سے اچھا ہو اور اس سے اگلے ہفتے اس سے بھی اچھا ہو تو پھر آدمی ترقی کے مدارج مسلسل طے کرتا چلا جاتا ہے۔

دسترس میں ہونا

یہ یقین بھی ضروری ہے کہ یہ منزل میری دسترس میں ہے۔ میں اس کو حاصل کر سکتا ہوں۔ جن کے اندر بے یقینی اور بے اعتباری ہو، وہ دنیا میں کوئی کام نہیں کر سکتے۔ جو شخص یہ سوچے کہ میں کیا ہوں، یا میں تو کسی قابل نہیں ہوں۔ وہ دنیا میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کے مقابلے میں اگر یہ سوچ ہو کہ میں تو خلیفۃ اللہ ہوں، مجھے اللہ نے اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا ہے، میرے دل میں اس نے رحمت، غصہ اور انتقام کے جذبات رکھے ہیں، مجھے اس نے دیکھنے اور سننے کی صلاحیت سے نوازا ہے اور عقل دی ہے اور جب اس نے مجھے اتنا کچھ عطا کیا ہے، ان سب کے باوجود بھی میں کچھ نہ کر سکوں تو دراصل یہ میں اپنے اوپر عدم اعتماد نہیں کرتا بلکہ اپنے رب پر اور اپنے پیدا کرنے والے پر عدم اعتماد کا اظہار کرتا ہوں اور جس کو اللہ پر، ساری کائنات کے خالق و مالک پر اعتماد نہ ہو وہ کہیں کا نہیں ہوتا۔

یہ کہنا اور سوچنا کہ میں اپنے رب کا بندہ ہوں، وہ جو کام مجھے دے گا میں اُسے کروں گا، اچھے سے اچھا کروں گا اور کر سکتا ہوں، یہ منازل میری دسترس سے باہر نہیں ہیں۔ انسان کو عظمت اور بلندی بخشتا ہے۔ اسے یہ بات پورے یقین اور اعتماد سے کہنی چاہیے۔ دعا کے بارے میں بھی یہی حکم ہے کہ بے یقینی کے ساتھ نہ مانگو۔ جو کچھ مانگو پورے یقین کے ساتھ مانگو کہ اللہ دے گا۔ پھر آدمی اپنے کام کے بارے میں کیوں بے یقینی اور بے اعتمادی کا شکار ہو۔ گویا وہ ساری منازل جو شخصیت اور جماعت کے ارتقا کے لیے ہیں آدمی کی دسترس میں ہیں۔

عشق و محبت اور ان کے معنیٰ بتانے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اپنے محبوب و مطلوب کی دل میں لگن اور آرزو ہو، اس کی تڑپ ہو، اس کے فراق میں آدمی جل رہا ہو اور جتنا اس کے قریب پہنچ جائے اتنا ہی خوش ہو، یہی عشق و محبت ہے۔ جو شخص اپنے مقصدِ زندگی اور نصب العین کا اظہار کرے اور اس کے بعد اس کو کوئی پروا نہ ہو کہ کیا اس کے ساتھ برتاؤ ہوتا ہے اور کیا معاملہ ہوتا ہے تو یہ عشق و محبت کا درجہ ہے۔ علامہ اقبالؒ نے بھی اپنی ایک مثنوی میں انھی تین باتوں کا تذکرہ کیا ہے: